www.Paksociety.com

آزاد قیدی

طاہر جاوید مغل

www.paksociety.com

www.Paksociety.com

جو کہانی کبھی نئی یا پرانی نہیں ہوتی، کہانی بس کہانی ہوتی ہے اور پھر کہانی بھی تو ایک ہی ہے وہی صدیوں پرانی مختلف وقتوں میں، مختلف لہجوں اور پیرایوں میں دہرائی جاتی رہی ہے۔ یہ بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ اس میں محبت کا عنصر نمایاں ہے۔ اس کہانی کا تعلق اس دور سے ہے جب تاریخ نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ جب انسان کو دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ جب دھرتی کے سینے میں تہذیب کی جڑیں بہت گہری نہیں اتری تھیں۔ جب ایک بادشاہ ہوتا تھا ایک رعایا ہوتی تھی۔ جب گھوڑی کی پشت پہ بیٹھ کر ملک فتح کئے جاتے تھے۔ اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو بیچا اور خریدا جاتا تھا۔

ایسے ہی ملک میں ایک غریب نوجوان سکندر رہتا تھا۔ سکندر اعظم کے ہاتھ تو موت کے وقت خالی ہوئے تھے اس نوجون کے ہاتھ شروع سے ہی خالی تھے۔ وہ منہ میں کسی چمچ کے بجائے بھوک لے کر پیدا ہوا تھا۔ لڑکپن سے ہی اس نے محنت کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ قالینوں کے ایک تاجر کے ہاں ملازم تھا۔ فارغ وقت میں وہ مصوری کرتا اور سنگ تراشی سیکھتا تھا۔ اس کے یہ مشاغل بھی اس کے لئے تھوڑی بہت آمدنی کا وسیلہ بن جاتے تھے۔ بہر حال یہ ساری آمدن مل کر بھی اتنی نہیں تھی کہ اس کی بیوہ ماں اور چار بہن بھائیوں کی کفالت کر سکتی۔ ان کی گزر بسر مشکل سے ہو رہی تھی۔ ایسے غریب نوجون کو کیا حق پہنچتا تھا کسی دوشیزہ کو دیکھنے کا۔ اس کی محبت دل میں بسانے کا اور دن رات اس کی یاد میں تڑپنے کا۔ لیکن یہ سب کچھ ہوا تھا اور کوئی ہونی کو نہیں روک سکتا اور سردی گرمی و خزاں کی طرح بہار بھی اٹل ہوتی ہے۔

چمکیلی صبح کی ڈولی میں بیٹھ کر گلابوں کے موسم کو آنا ہوتا ہے اور وہ آ کر رہتا ہے۔ سکندر کو جس دوشیزہ سے پیار ہوا تھا اس کا نام ماہ رو تھا۔ ماہ رو یعنی چاند چہرے والی۔ وہ چاند کی طرح خوبصوت تو تھی لیکن چاند کی طرح سکندر سے دور بھی تھی۔ کبھی کبھی تو سکندر کو لگتا وہ چکور کی طرح چاند کی طرف اڑ اڑ کر ہانپ جائے گا اور کسی رات پٹ سے زمین پہ گر کر ختم ہو جائے گا۔ ماہ رو اس کی دور کی رشتے دار تھی اس کا باپ ایک رئیس کے اصطبل کا پہرہ دار تھا۔ ماہ رو اور سکندر کی نسبت بھی طے ہو چکی تھی لیکن اب کچھ عرصے سے حالات کچھ ایسے ہوئے تھے کہ یہ نسبت خطرے میں پڑتی محسوس ہو

رہی تھی اور کسی وقت تو سکندر کو لگتا وہ ہمیشہ کے لئے اپنی ماہ رو کو کھودے گا۔ وہ سارے خواب مٹی میں مل جائیں گے جو اس کی سنکھوں نے گئے موسموں میں دیکھے ہیں۔ دراصل ماہ رو کا باپ اس رئیس کا قرض دار تھا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اب ادھیڑ عمر رئیس اس قرض کے بدلے میں ماہ رو کے باپ سے ماہ رو کا ہاتھ مانگ رہا تھا۔ ہاں وہی صدیوں پرانی رواداد ماہ رو کے پاب نے اس صروت حال سے بچنے کے لئے سر توڑ کوشش کی تھیلیکن اب بتدریج وہ رئیس کے سامنے بے بس ہوتا جارہا تھا۔ چند روز پیشتر ایک مذہبی تہوار کے موقع پر سکندر کی ملاقات جب ماہ رو سے ہوئی تو ماہ رو نے صاف کہہ دیا اگر وہ کچھ کر سکتا ہے تو کرلے

اس نے کہا" سکندر! میرے بابا کو رئیس نے آخری موقع دیا ہے اگر دو ماہ کے اندر اندر ہم نے رئیس کو پانچ ہزار اشرفیاں نہیں دی تو وہ مجھے زبردستی اپنے گھر لے جائے گا۔ قاضی نے بھی فیصلہ دے دیا ہے۔ اور اگر میں یہ فیصلی نہ مانی تو اس کی سزا میرے باپ کو بھگتنا پڑے گی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرا کمزور باپ قید خانے کی ذلت برداشت کرے اور میں اپنی محبت بچانے کے لئے اس کی بوڑھی کھال کو کوڑوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دوں۔"

دو ماہ کی مدت تھی اور اس میں سے چار پانچ روز گزر چکے تھے۔ سکندر اس مدت میں کیا کر سکتا تھا۔ شاید وہ خود کو بیچ بھی دیتا تو یہ رقم حاصل نہکر سکتا۔ ایک روز وہ مایوسی کی انتہا کو چھو رہا تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکلا اور یونہی گلیوں میں چلتا شہر سے دور نکل آیا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا وہ کدھر جا رہا ہے۔ بس وہ چلتے رہنا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا وہ ٹہر گیا تو دم بدم بڑھتی گھٹن کے سبب اس کا دل بھی ٹہر جائے گا۔ وہ ویرانے میں چلا گیا۔ بہت آگے ایک خشک ندی کے کنارے لمبی جنگلی گھاس اور گھنے درخت تھے۔ وہ ایک سایہ دار جگہ پہ بیٹھ گیا اور اپنے حالات پہ غور کرنے لگا۔

اسے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ایک مدہم آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کچھ آگے بڑھ کر سر کنڈوں میں دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ ایک آہنی پنجرے کے اندر ایک حبشی غلام بیٹھا تھا۔ اس کے کھانسنے کی آواز ہی سکندر کے کانوں تک پہنچی تھی۔ غلام کے جسم پہ صرف ایک لنگوٹی

تھی۔اس کی غلامی کی نشانی ایک طوق نما چرمی پٹی تھی جو اس کی گردن میں نظر آ رہی تھی۔اس پٹی پہ غلام کے نام کی مخصوص مہر تھی۔غلام جوان تھا اس کا رنگ بہت سیاہ نہیں تھا۔آنکھیں روشن تھیں اور شکل و صورت میں جاذبیت تھی۔وہ کسرتی جسم کا مالک رہا ہو گا لیکن اب اس کے رگ پٹھے کمزور نظر آ رہے تھے۔چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔سکندر کا خیال تھا کہ نوجوان حبشی پنجرے میں بند ہے۔لیکن جب اس نے غور کیا تو یہ دیکھ کر حیراں ہوا کہ پنجرے کا دروازہ کھلا ہے۔

نوجواں حبشی اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔اس کے انداز میں عجیب سی بے تعلقی پائی جاتی تھی۔سکنرر ے اس سے پوھا وہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے؟

غلام نے تھوڑے تذبذب کے ساتھ جواب دیا اس کا نام قابوس ہے اور وہ شاہی غلام ہے۔

سکندر نے]پوچھا" شاہی غلام ہو تو یہاں کیا کر رہے ہو؟"۔

نوجوان حبشی نے ایک گہری سانس لی اور بولا" یہ ایک لمبی کہانی ہے دوست"۔

"سکندر نے کہا" تمہاری یہاں موجودگی حیران کن ہے۔میں تمہارے بارے میں جاننا چاہوں گا۔

دونوں نوجوان کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ان کے خیالات میں ہم آہنگی تھی۔بہ جلد انھیں محسوس ہونے لگا کہ وہ ایک دوسرے کو مدت سے جانتے ہیں۔سکندر کو اندازہ ہوا کہ قابوس ایک بلکل سیدھا سادہ نوجوان ہے۔وہ ذرا سا اٹک اٹک کر بولتا تھا۔اس نے بہت کم بات کی تاہم جو بھی اس کی زبان سے ادا ہوا وہ غم و اندوہ کی دل گداز داستاں محسوس ہوا۔سکندر خود بھی ایک دل فگار شخص تھا اسے قابوس کی صحبت پسند آئی۔قابوس نے سکندر سے کہا کہ تم اپنے بارے میں بتاؤ پھر میں بتاؤں گا۔

سکندر نے پہلے اپنا تعارف کروایا۔اپنا مکمل پتا ، ٹھکانہ بتایااور اپنی رودادِ غم مختصر الفاظ میں قابوس کے گوش گزار دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

قابوس توجہ سے سنتا رہا سکندر اور ماہ رو کا غم محسوس کر کے اس کی آنکھوں میں یاس کی پرچھائیاں لہرانے لگیں۔ یہ سن کر اسے یقینا بہت دکھ ہوا تھا کہ سکندر اور ماہ رو درمیان چاندی کی دیوار حائل ہو رہی ہے اور وہ عنقریب ایک دوسرے سے بچھڑنے والے ہیں۔ ایک شکستہ دل ہی دوسرے شکستہ دل کا درد سمجھ سکتا ہے۔

سکندر کے بعد حبشی قابوس نے اپنی روداد سنائی۔ اس نے بہت سیدھے سادھے الفاظ میں جو کچھ بتایا وہ کچھ یوں تھا۔

www.Paksociety.com

قابوس غلام کی حیثیت سے شاہی محل میں رہتا تھا۔شاہ ارژنگ کی ایک بہت پیاری بیٹی شہر بانو تھی۔بے حد خدا ترس اور محبت بھرا دل رکھنے والی۔شہزادی شہر بانو کی نگاہ میں قابوس کو اہم مقام حاصل تھاوہ اس کی وفاداری، جانثاری پہ بھروسہ کرتی تھی۔لڑکپن ہی سے وہ قابوس کو پیار سے طوطو کہا کرتی تھی۔قابوس کو دیکھتے ہی شہزادی کے چہرے پہ رونق آجاتی تھی۔قابوس کو بات کرنے کا ڈھنگ وت نہیں آتا تھا مگر پھر بھی وہ دلچسپ آدمی تھا۔وہ مضحکہ خیز شکلیں بنا کر اور آوازوں کی نقل کر کے ہنسانے کا فن جانتا تھا۔وہ پرندوں اور جانوروں کی آواز اتنی خوبصورتی سے نکالتا تھا کہ سننے والا ششدر رہ جاتا تھا خاص طور سے طوطے کے لہجے میں وہ بڑی دلچسپ گفتگو کرتا تھا۔شاید اسی لئے شہزادی نے اس کا نام طوطو رکھ دیا تھا۔وہ جب ہرا لباس پہن کر گلے میں سرخ پٹا باندھ کر جب شہزادی کے سامنے آتا تو وہ خوب محظوظ ہوتی۔

قابوس کو شہزادی کے دل کا حال معلوم نہیں تھا مگر اپنے دل کا حال وہ اچھی طرح جانتا تھا۔گزرے ماہ و سال نے اسکے دل پہ خوبرو شہزادی کے نقش بہت گہرے کر دیئے تھے۔وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگا تھا۔یہ خاموش محبت تھی۔عمیق سمندروں سے زیادہ گہری اور تاریک ترین غاروں سے زیادہ پراسرار۔اسے محبت اور عشق وغیرہ کے معانی نہیں معلوم تھے۔وہ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ ہر دم شہزادی کے قریب رہنا چاہتا ہے۔اس فضا میں سانس لینا چاہتا ہے جس میں شہزادی کے سانسوں کی مہک ہو۔اور ان راستوں کو آنکھوں سے چومنا چاہتا ہے جن پر شہزادی کے قدم پڑتے ہیں۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں تو قابوس عام غلاموں کی طرح پابہ زنجیر رہتا تھا اور سخت مشقت کے کام کرتا تھا۔لیکن پھر پرکھنے والے آنکھوں نے اس کی صلاحیت اور وفاداری کو پرکھ لیا۔سب سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلے شہزادی شہر بانو نے ہی والد کو بتایا کہ طوطو نامی غلام آوازوں کی نقل اتار لیتا ہے اور الٹی سیدھی حرکات کر کے لوگوں کے بے ساختہ قہقہے لگانے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ بعد ازاں بادشاہ اور ملکہ نے بنفس نفیس قابوس عرف طوطو کی ان صلاحیتوں کا مشاہدہ کیا تھا اور اس کے لئے کچھ رعایتیں فراہم کر دیں تھیں۔ اب اسے کم مشقت والا کام سونپا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کام کے اوقات میں اسے زنجیر و طوق وغیرہ سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ کبھی کبھی قابوس کو محل کے اندر بھی بلا لیا جاتا تھا اور اس کی فن کاری دیکھی جاتی تھی۔ قابوس حاضرین کو خوب ہنساتا تھا۔ خصوصاً جب شہزادی شہر بانو سامنے ہوتی تو اس کی صلاحیتوں کو چار چاند لگ جاتے تھے۔

شہزادی قابوس کی ہم عمر تھی یا شاید تھوڑی سی بڑی ہی تھی۔ ویسے بھی وہ آقا تھی اور قابوس غلام۔ قابوس کو مخاطب کرتے ہوئے شہزادی کے لہجے میں کسی وقت شفقت سی جھلکنے لگتی تھی۔ وہ "بڑے پیار سے کہتی" طوطو ہمارا گھوڑا لاؤ۔

قابوس گھوڑا لاتا پھر گھٹنوں اور کہنیوں کے بل جھک جاتا۔ وہ اس کی پشت پہ پاؤں رکھ کر گھوڑے پہ سوار ہو جاتی۔ قابوس کے کسرتی بدن کے لئے شہزادی کا وزن پھول سے بھی کم ہوتا۔ وہ گھوڑے کی لگام تھام لیتا اور شہزادی کو محل کے پچھوارے باگ میں لے جاتا۔ شہزادی اس کی پشت پہ پاؤں رکھ کر اترتی۔ مصنوعی جھیل کے کنارے وہ دونوں پھلوں، پھولوں تتلیوں اور جھرنوں کے درمیان گھومنے لگتے۔ وہ ادب سے ہاتھ باندھ کر سر جھکائے اس کے پیچھے چلتا۔ وہ اس کی باتوں پہ ہنستی تو ہر طرف کلیاں کھل اٹھتیں۔ کبھی قابوس کی باتوں پہ ہنستے ہوئے وہ عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتی۔ اس نگاہ کی عمر صرف ایک لمحہ ہوتی تھی۔ مگر اس کی تاثیر ماہ و سال پہ محیط ہوتی تھی۔ اس ایک لمحے میں قابوس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہزادی، شہزادی نہیں ہے۔ اور وہ غلام نہیں ہے وہ دونوں صرف انسان ہیں اور ان دونوں کے دل بے پناہ قوت سے ایک دوسرے کی
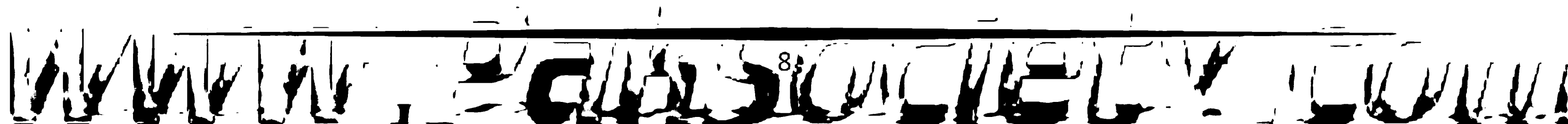
طرف کھنچ رہے ہیں۔کوئی انجانی کشش ہے جو انھیں ایک نقطہ پہ اکٹھا کرنا چاہ رہی ہے۔لیکن اگلے ہی لمحے یہ لمحہ گزر جاتا۔شہزادی پھر سے شہزادی بن جاتی اور اس سے ہزاروں ، لاکھوں میل کے فاصلے پہ چلی جاتی۔کبھی کبھی رونما ہونے والے اس لمحے کے بارے میں قابوس نے سینکڑوں بار سوچا۔کیا یہ لمحہ ہمیشہ ایک لمحہ ہی رہے گا؟ اس کے ذہن مین ہر بار یہ سوال ابھرا تھا۔

پھو یوں ہوا کہ محل میں خاص قسم کی چہل پہل نظر آنے لگی۔مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔زنان خانوں میں نت نئی پوشاکیں سر سرانے لگیں اور کشیدہ کار عورتیں ریشم ، اطلس و کمخواب پہ چاند ستارے اتارنے لگیں۔محل کے ایونوں میں نئے نئے چہرے نظر آنے لگے۔اور گیتوں کے پس منظر میں سارا دن خواتین کے قہقہے گونجنے لگے۔ایک دن حبشی قابوس پہ یہ انکشاف ہوا کہشہزادی شہر بانو کی شادی ہو رہی ہے اور وہ عنقریب پیا کے دیس سدھار رہی ہے۔یہ خبر قابوس کے لئے غیر متوقع نہیں تھی مگر پھر بھی اس پہ بجلی بن کر گری۔اس رات وہ صبح تک کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ شہزادی کی شادی کی اطلاع نے اسے غم زدہ کیوں کیا؟کیا اسے حق پہنچتا ہے ایسی اطلاع پہ غمزدہ ہونے کا؟وہ غلام زادہ ہے اس کا مذہب یہ ہے کہ اپنے آقا کی خوشی پر خوش ہو اور اس کے غم کو اپنا غم سمجھے۔

اس رات اور اس کے بعد کئی راتوں تک وہ اپنے دل کو سمجھاتا رہا۔وہ صرف ایک غلام تھا اور اسے غلام بن کر ہی رہنا تھا۔وہ ایک لمحہ اس نے اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا جو کبھی کبھی شہزادی کی آنکھون میں چمکا کرتا تھا اور ایک روشن شعاع کی طرح قابوس کے دل میں اتر جایا کرتا تھا۔

پھر ایک روز قریبی ملک کا بانکا سجیلا شہزادہ بارات لے کر آیا اور شہزادی شہر بانو اس کی بیوی بن گئی۔غلام زادے نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے سینے پہ جھیلا۔اس وقت کے رواج کے مطابق دولہا شہزادہ سات روز تک سسرال میں مقیم رہا۔اس کی خوب خاطر مدارت ہوئیں۔حسین و

جمیل شہزادی اور اس کے اہل خانہ شہزادے کی راہوں میں آنکھیں بچھا رہے تھے۔شہزادی نے قابوس کو بھی اپنے شوہر نامدار سے ملایا۔وہ تعارف کروانے والے انداز میں بولی "یہ طوطو ہے۔ ہمارا ذاتی غلام، بہت ہنس مکھ ، بہت دلچسپ اور وفاداری میں تو یہ اپنی مثال آپ ہے ، اس کا خاندان کئی پشتوں سے محل کا خمت گزار ہے۔"

پھر شہزادی نے حسب عادت قابوس کو حکم دیا کہ وہ دولہا شہزادے کو اپنی دلچسپ حرکات و گفتار سے محظوظ کرے۔اس روز قابوس نے کمال کر دیا۔ہنس ہنس کر سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔قابوس کا خیال تھا کہ شہزادہ بھی اس کی تعریف کرے گا مگر یہ مراد بر نہیں آئی۔تعریف کے موقع پر شہزادے نے کافی کنجوسی کا مظاہرہ کیا۔اگلے ایک دو روز میں قابوس کا یہ اندازہ درست ثابت ہو اکہ شہزادے نے اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔اپنے ارد گرد قابوس کی موجودگی محسوس کر کے شہزادے کے چہرے پہ بیزاری کی شکن نمودار ہو جاتی تھی۔پتا نہیں ایسا کیوں تھا۔شاید قابوس کو دیکھ کر شہزادی شہر بانو کے چہرے پہ جو مسکراہٹ کھل اٹھتی تھی شہزادے کو پسند نہیں آئی تھی۔ہرحال شہزادے کی ناگواری محسوس کر کے اگلے چند روز تک قابوس شہزادے کی نگاہ سے دور دور رہا۔

شہزادی جب ساتویں روز اپنے سسرال روانہ ہوئی تو اس کے ساتھ بہت سے ساز و سامان کے علاوہ قابوس بھی تھا۔وہ ذاتی غلام کی حیثیت سے شہزادی کے جہیز میں جا رہا تھا۔مقامی دستور کے مطابق غلاموں کو دوران سفر زنجیریں پہنا دی جاتی تھیں یا پنجرے میں بند کر دیا جاتا تھا۔قابوس اور دیگر تین غلامون کو بھی خوبصورت پنجرے میں بند کیا گیا اور گھوڑو گاڑی میں لاد دیا گیا۔

یہاں تک اپنی روداد سنانے کے بعد حبشی قابوس خاموش ہو گیا۔اس کی سفید آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔دل جیسے غم سے لبریز ہو گیا۔اس نے اپنا مدقوق چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور آنسو پینے

www.paksociety.com

کی کوشش کرنے لگا۔یہ کوشش کافی طویل ثابت ہوئی۔رہ رہ کر ایک سرد آہ حبشی غلام کے ہونٹوں سے نکلتی تھی اور فضا کو سوگوار کر جاتی تھی۔

آخر اس نے سر اٹھایا اور گلو گیر آواز میں بولا" اب تم یہاں سے جاؤ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دو"

"لیکن تمہاری رواداد نامکمل ہے تم نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟ اور شہزادی اب کہاں ہے؟"

"شہزادی وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہئے تھا۔اور میں وہیں ہوں جہاں مجھے ہونا چاہئے تھا" وہ حسب عادت اٹک اٹک کر بولا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔"سکندر نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمھیں کچھ سمجھا بھی نہیں سکتا۔میں غلام زادہ ہوں اور میرے لئے شکوہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔" قابو سکا گلا رندھ گیا تھا اس کی آنکھیں اندرونی کرب کے سبب سرخ ہو رہیں تھیں اس نے سکندر کی طرف سے رخ پھیرا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا" تم مصور ہو نا؟"

"ہاں لوگوں کا خیال ہے میں اچھی تصویریں بنا لیتا ہوں۔"

"تو پھر میری ایک بات مانو"۔

"ہاں ہاں کہو۔"

"ممکن ہے میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں لیکنا گر میں نہ آیا تو تم ٹھیک دو ہفتے بعد دوبارہ اس جگہ آنا۔یہاں پہنچ کر تم اپنے ارد گرد دیکھنا۔جو منظر تمھیں سب سے عجیب لگے اس کی ایک تصویر بنا لینا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"بس جو میں کہہ رہا ہوں اس کو دماغ میں رکھو۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اچھا تصویر بنانے کے بعد کیا کروں؟"

"تم یہ تصویر لے کر شہزادی شہر بانو کے ملک چلے جانااس کی سسرال ڈھونڈنا تمہارے لئے مشکل نہیں ہو گا۔ظاہر ہے شاہی محل ہی اس کی سسرال ہو گی۔تم اپنی وہ تصویر شہزادی شہر بانو کو دکھانا۔مجھے یقین ہے وہ تصویر شہزادی کو ضرور پسند آئے گی۔شہزادی وہ تصویر تم سے لے لے گی۔شاہی محلوں میں رہنے والے جب کسی سے کوئی چیز لیتے ہیں تو بدلے میں انعام و اکرام ضرور دیتے ہیں۔مجھے امید ہے کہ شہزادی تمہیں فراغ دلی سے نوازے گی۔اس انعام و اکرام سے تم وہ قرض آسای سے اتار سکو ے جو تمھیں تمہاری ماہ رو سے دور کر رہا ہے۔

"

سکندر کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔اس نے قابوس کو ٹٹولنے کی بہت کوشش کی لیکن ناکامی ہوئی۔وہ جیسے ایک دم اپنے خول میں بند ہو گیا تھا اور سکندر سے کچھ کہنا سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ایک عجیب سی یاسیت طاری تھی اس پر۔

اپنے ذہن میں کئی سوال لئے سکندر اس ویرانے سے واپس گھر آگیا۔گھر آ کر وہ کئی دن تک سوچتا رہا قابوس نے آخر کس منظر کا ذکر کیا تھا۔وہ کیا چیز ہے جس کی تصویر اسے بنانا تھی اور شہزادی شہر بانو کے پاس لے کر جانا تھی۔وہ دو ہفتے والی شرط بھی بار بار اس کے ذہن میں کھٹک رہی تھی۔قابوس نے یہ کیوں کہا کہ وہ دو ہفتے سے پہلے دوبارہ یہاں نہ آئے؟۔وہ دن سکندر نے بڑی مشکل سے کاٹے۔چودہ دن گزار کر پندرھویں روز اس نے مصوری کا مختصر سامان اٹھایا اور اپنے تجسس کی انگلی تھام کر خراماں خراماں اس ویرانے کی طرف روانہ ہوا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

طویل مسافت پا پیادہ طے کر کے وہ دوپہر کے وقت اس جنگل میں پہنچ سکا۔مقررہ جگہ پہ پہنچ کر وہ دنگ رہ گیا۔اسکی تما حیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئی تھیں اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔آہنی پنجرہ اپنی جگہ موجود تھا اور اس کے اندر حبشی قابوس بھی موجود تھا۔لیکن زندہ حالت میں نہیں وہ مر چکا تھا۔پرندے اور جانور اس کے جسم کا گوشت نوچ کر کھا چکے تھے۔اور اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہا تھا۔یہ ڈھانچہ پنجرے کی سلاخوں کے سہارے نیم دراز تھا۔جیسے مرنے والا کچھ سوچتے سوچتے یا کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے ابدی نیند سو گیا ہو۔مرنے والے کی گردن میں اب بھی مہر والی چرمی پٹی موجود تھی۔لیکن اس کی روح ہر بندھن سے آزاد ہو چکی تھی۔

اس اندوہناک منظر نے سکندر کے دل و دماغ پہ بہت گیرا اثر کای۔وہ دیر تک آہنی پنجرے اور انسانی ڈھانچے کو خالی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر نڈھال سا زمین پہ بیٹھ گیا۔دیرے دھیرے اس کے حواس کام کرنے لگے۔اسے یاد آیا کہ قابوس نے اس سے کیا کہا تھا۔اسے یہاں نظر آنے والے سب سے انوکھے منظر کی تصویر بنانا تھی۔اس سے انوکھا منظر بھلا اور کیا ہو سکتا تھا۔ایک شخص آہنی پنجرے میں موجود تھا۔پنجرے کا دروازہ کھلا تھا لیکن قیدی پنجرے سے نکلا نہیں تھا۔وہ بھوکا پیاسا اپنے قفس میں بند رہا اور جان دے دی۔

سکندر نے اپنے آنسو پونچھے کینوس کو ہموار کیا۔اپنے رنگ سنبھالے اور بڑی وارفتگی سے منظر کشی میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

شہزادی شہر بانو اپنے محل میں موجود تھی۔خوبصوت پائیں باغ میں وہ ایک فورے کے نزدک گم صم بیٹھی تھی۔شاہی مغنیہ کا گیت فضا میں گونج رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف سے بے خبر تھی۔قوس و

www.paksociety.com

قزاح کے رنگوں والے پھول، شاخوں پہ چہکتے ہوئے پرندے ، کچھ بھی تو اس کے دل کو نہیں بھا رہا تھا۔ آج کئی دن بعد وہ پھر بے وجہ اداس ہو گئی تھی۔ایک خواجہ سرا اجازت لے کر اندر داخل ہوا ۔تعظیم پیش کرنے کے بعد اس نے شہزادی سے کہا۔" شہزادی حضور ایک نوجوان شرف بازیابی "چاہتا ہے۔وہ مصور ہے اور آپ کی خدمت میں کوئی تصویر پیش کرنے کا خواہش مند ہے۔

" کون ہے وہ۔؟ "

کہیں بہت دور سے آیا ہے چہرے پہ طویل مسافت کے آثار ہیں۔وہ اپنی تصویر کے بارے میں "

"بہت پر امید ہے۔

ٹھیک ہے اسے اندر لاؤ" شہزادی شہر بانو نے کہا۔ "

چند لمحے بعد خستہ حال سکندر اپنی تصویر کے ساتھ پائیں باغ میں داخل ہوا۔ تین بار فرشی سلام کرنے کے بعد وہ کھڑا ہو گیا۔

شہزادی نے اسے تصویر دکھانے کا حکم دیا۔سکندر نے تصویر کا گلاف ہٹایا اور بڑے سلیقے سے اسے شہزادی کے دیکھنے کے لئے رکھ دیا۔شہزادی نے پہلے تو تصویر کو عام سے انداز میں دیکھا۔ پھر یک دم وہ چونک گئی۔اس کی آنکھوں میں بتدریج ہیجانی کیفیت نمودار ہونے لگی۔چہرہ رنگ پہ رنگ بدل رہا تھا۔تسویر کا فریم دونوں ہاتھوں میں تھام کر وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ کتنی دیر بعد اس نے سکندر کی طرف نگاہ اٹھائی۔اس کی حسین آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔کانپتی ہوئی آواز میں بولی" کہاں " دیکھا تم نے یہ سب کچھ؟

سکندر نے

مو

WWW.PAKSOCIETY.COM

دب لہجے میں شہزادی کو اس سنسان جنگل کے بارے میں بتایا جو ایک خشک ندی کے کنارے دور ¾ تک پھیلا ہو اتھا اور جہاں ایک روز اتفاقاً سکندر چلا گیا تھا۔اس نے شہزادے کو فاقہ زدہ غلام اور آہنی پنجرے کا حال سنایا۔

نجانے شہزادی کو اچانک کیا ہو اس نے تصویر اٹھائی اور بھاگتی ہوئی محل سرا کےاندرونی حصے میں چلی گئی۔یقینا وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

مفلوک الحال سکندر کو شہزادی کی شکل پورے دو روزبعد نظر آئی تھی۔شہزادی نے ایک خادمہ کے زریعے اسے محل سرا میں طلب کیا تھا۔اوہ اس پھول کی طرح نظر آرہی تھی جو موسم سرما کی طویل رات میں صبح تک شبنم سے نہاتا رہا ہو۔اس کی آنکھیں مسلسل رونے سے سوج چکی تھیں۔اور چہرہ اندوہ کی تصویر تھا۔اس مرتبہ شہزادی شہر بانو نے شہزادی سے ساری بات تفصیلا پوچھی۔سکندر نے بھی کچھ چھپا کر نہیں رکھا الف سے ی تک سارا ماجرا کہہ سنایا۔شہزادی سنتی رہی اور اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔اس نے کرید کرید کر سمندر سے پوچھا کہ آخری ملاقات میں طوطو (قابوس) سے کیا کیا باتیں ہوئیں۔طوطو نے کس لہجے میں کیا کیا کہا تھا۔شایس وہ چاہ رہی تھی کہ سکندر اس پوری ملاقات کا نقشہ اس کی آنکھوں کے سامنے کھینچ ڈالے۔اور جب سکندر یہ نقشہ کھینچ رہا تھا تو بے اختیار ہچکیوں سے رونے لگی۔

بہت دیر بعد اس کے آنسو تھمے اور اس نے سکندر سے کہا" مصور ! ہم تمہاری یہ تصویر منہ مانگی قیمت پہ خریدنا چاہتے ہیں۔"

سکندر بولا" شہزادی حضور میں ایسی جسارت نہیں کر سکتا۔میری طرف سے یہ تصویر ایک حقر تحفہ سمجھ کر قبول فرما لیجئے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہزادی اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے ایک منہ بند تھیلی سکندر کی گود میں ڈال دی۔"یہ تمہاری تصویر کی قیمت نہیں ہے مصور۔" وہ گلو گیر آواز میں بولی" اس درد ناک تصویر کی کوئی قیمت ہو ہی نہیں سکتی۔"

" رخصت ہونے سے پہلے سکندر نے کہا" شہزادی حضور ! ایک بات پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟

" کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ "

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا"شہزادی حضور ! حبشی غلام کی روداد میں ایک کڑی غائب تھی۔وہ آہنی پنجرہ تو آپ کی برات کے ساتھ روانہ ہوا تھا وہ وہاں کیوں پڑا رہ گیا؟ "

سکندر کو ایک پل کے لئے محسوس ہوا کہ شہزادی اس مداخلت پہ خفا ہو جائے گی لیکن پھر ایک دم وہ پر سکون ہو گئی۔شاید وہ خود بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔کسی ایسے شخص کے سامنے اپنا دکھ بیان کر دینا چاہتی تھی جس کا تعلق اس کے وطن سے تھا۔اس کی مٹی اور ان فضاؤں سے تھا جہاں وہ برسوں سانس لیتی رہی تھی۔وہ بولی" طوطو کو ہمارے محترم شوہر نے آزاد کیا تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ ایک غلام کی حیثیت سے ہمارے ساتھ ساتھ یہاں تک آئے۔" وہ ہماری شادی کی خوشی میں اسے آزاد کر دینا چاہتے تھے۔سفر کے دوران انھوں نے اس کا آہنی پنجرہ گھوڑا گاڑی سے اتروا کر جنگل میں رکھ دیا تھا۔لیکن جب اسے پنجرے سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو وہ اس کی سلاخوں سے چمٹ گیا۔وہ دہائی دینے لگا کہ اسے موت قبول ہے لیکن رہائی نہیں۔شاید شاید وہ سچ مچ کا ہی طوطا تھا جو پنجرے کو ہی اپنا گھر سمجھتا ہے اور کھلی فضاؤں میں اڑنے سے انکار کر دیتا ہے۔ہم جانتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا چاہتا ہے ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے۔لیکن ہم مجبر تھے اپنے سرکار کی خوشنودی ہمیں ہر حالت میں عزیز تھی۔ہم نے طوطو کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ہم نے کہا

www.urdusociety.com

تھا "تمہارے پنجرے کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔اب تم آزاد ہو ایک نئے ڈھنگ سے اپنی زندگی شروع کر سکتے ہو۔"

"وہ اٹک اٹک کر بولا تھا " غلام زادہ آزاد نہیں ہے شہزادی اس کے پاؤں میں اب بھی زنجیر ہے۔
اس نے اور کچھ نہیں کہا تھا لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہیں تھیں۔وہ آنکھیں ہمیں بتا رہیں تھیں کہ وہ ہمارا انتظار کریں گی۔آخری وقت تک زندگی کی آخری رمق تک۔وہ اس امید میں کھلی رہیں گی کہ ہم پلٹ کر آئیں گے۔آخری الفاظ ادا کرتے کرتے سوگوار شہزادی پھر سسکنے لگی۔

©

" ہمیں کیا پتا تھا طوطو تو ضد کا اتنا پکا نکلے گا پتا ہوتا تو پتا ہوتا تو "©

الفاظ اس کے حلق میں اٹل کر سسکیوں میں ڈوب گئے۔وہ ٹوٹ کر رو رہی تھی۔شاید آج قابوس نے اس سے اپنے سارے قہقہے واپس لے لئے تھے۔اسی لمحے سکندر کو محسوس ہوا کہ یقینا قابوس نے سچ ہی کہا تھا۔شہزادی کی آنکھوں میں کبھی نہ کبھی وہ لمحہ ضرور چمکتا ہو گا۔جب شہزادی ، شہزادی نہ رہتی ہو گی۔قابوس قابوس نہ رہتا ہو گا۔صرف ایک نوجوان بن جاتا ہو گا۔اس لمحے وہ دونوں صرف ایک مرد اور عورت کی حیثیت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہونگے۔ان کی آنکھوں میں وہ برق چمکتی ہوگی جو آدم اور حوا کی آنکھوں میں ایک دوجے کو دیکھ کر چمکی تھی ہاں ایسا ضرور ہوا ہو گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

باقی کہانی زیادہ طویل نہیں ہے۔سکندر انعام کی تھیلی لے کر اپنے ملک واپس آ گیا۔رئیس کی دی ہوئی مہلت ختم ہونے میں صف دو تین دن باقی تھے۔آخری دو تین دن جو ماہ رخ اور سکندر کی ابدی جدائی کے درمیاں حائل تھے۔سکندر نے رئیس کی واجب الادا رقم اس کے سامنے پھینکی۔اور بڑی سج دھج سے اپنی ماہ رو کو پنا لیا۔۔محبت کی ایک ادھوری کہانی نے محبت کی ایک مکمل کہانی کو جنم دیا تھا۔

قابوس اور شہزادی کی ادھ کھلی محبت کا پھول بکھر گیا تھا۔لیکن اس کی پتیوں نے زمین میں سرایت کر کے نئے لالہ و گل کو نمو دی تھی۔جس سہانی روت سکندر نے اپنی دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا اور اس کے سرخ لبوں کو بوسہ دیا نجانے کیوں اس کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔شاید شاید اس کے تصور میں وہ سنسان جنگل آ گیا تھا جہاں جھاڑ جھنکار کر درمیان ایک آہنی پنجرہ رکھا تھا اور پنجرے کے قریب ایک طوطو کی قبر تھی۔

ایک ہنسانے والے طوطو کی قبریہ قبر سکندر نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی اور اس پر اپنے آنسوؤں سے چھڑکاؤ کیا تھا۔

☆☆☆ختم شُد☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM